ڈاکٹر وسیم اسحاق* صہیب اکرام**

علامہ اقبال کا اردو کلام اور تصورِ حیات

Abstract: *Allama Iqbal's concept of life is not an isolated and stand-alone conept. In fact, it is embedded with many other vital thoughts in Iqbal's poetry. Therefore, in order to understand Iqbal's concept of life we need to consider and analyze some important points. Some of them, also brought under discussion in this thesis, may be like following:*
What is relation between Iqbal's philosophy of 'Khudi' and life?
Has Iqbal used 'Independence' and Life in same meanings? Is there any concept of life in Iqbal's thoughts without Independence? Is a real life possible under slavery or oppression?
What were the circumstrances around Iqbal during his bringing up and studies? Have they played a role for Iqbal in development of specific concepts about life as they are presented in Iqbal's poetry?
How Iqbal considers struggle, resistance and dynamistic attitude in relation with life?
These and similar questions are motivation behind this writing which is just a humble attempt to acknowledge and give tribute to this great poet and philosopher.

اقبال کے نزدیک زندگی اور شاعری میں کیا تعلق تھا اس کی جھلک مجنوں گورکھپوری کے ان الفاظ میں ملتی ہے۔

"اقبال شاعری اور دوسرے فنونِ لطیفہ کو زندگی کی بشارت سمجھتے تھے۔ اگر شاعر زندگی کا پیغام نہیں دیتا۔ اگر اس کے منہ سے نکلی ہوئی باتیں ہمارے دل میں ولولۂ حیات اور نشاطِ کار پیدا نہیں کرتیں۔ اگر اس کے "اندیشہ ہائے افلاکی" زمین کے ہنگاموں کو ہم پر سہل نہیں کرتے تو اقبال کے معیار سے وہ شاعر نہیں ہے۔ شاعر کو زندگی کا رہنما ہونا چاہیے۔" (1)

اقبال کا گردوپیش اور ان کی فکر

اقبالیات ایک ایسا موضوع ہے جس پر گزشتہ ایک صدی بلکہ اس سے بھی پہلے سے لکھا جا رہا ہے اور اس میدان سے شغف رکھنے والوں پر یہ بات عیاں ہے کہ آئندہ وقت میں بھی اس پر توجہ اسی طرح مرکوز رہے گی۔ کسی بھی فرد، اس کی فکر اور شاعری پر اتنا لکھا جائے تو اس بات کا امکان نہ ہونے کے برابر رہ جاتا ہے کہ کوئی موضوع ابھی بھی تشنۂ تحریر رہ گیا ہو۔ اقبال کے حوالے سے اس سدابہار رجحان کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اقبال کا کلام پرت در پرت ایسے کثیر جہتی مفاہیم کا حامل ہے اور اس میں افکار کی ایسی کثرت ہے کہ جو آشکار ہونے کے لیے گہرے غور و خوض کے متقاضی ہیں۔ چنانچہ اہلِ علم بساط بھر اقبال کی تفہیم میں اپنا اپنا حصّہ ڈال رہے ہیں اور اقبال کے کلام اور فکر کی تشریح

* اسسٹنٹ پروفیسر، نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی، اسلام آباد۔
** ملتان۔

میں اپنے ذوق اور فہم کے مطابق نت نئے نکات اور زاویے سامنے لا رہے ہیں۔ یہ دراصل ایسا بحر بیکراں ہے کہ گراں قدر موتی اور لعل اس کی تہہ میں منتظر ہیں اور ہر غوّاص اپنی محنت، تحقیق اور عقیدت کے شایانِ شان اپنا دامن بھر رہا ہے اور باقی دنیا کو بھی اس خزانے کی جھلک دکھلا رہا ہے۔

علامہ اقبال نے اس دور میں آنکھ کھولی جب انگریز یہاں اپنے قدم پورے طور پر جما چکے تھے۔ وہ ان چند مفکرین میں سے ہیں جنہیں برصغیر میں بدلتی سیاسی صورتحال کے عمیق مشاہدے کا موقع ملا۔ جس استعماری رویے کا شکار اس وقت اہل ہندوستان تھے، اقبال نے نہ صرف ہندوستان میں اس کا بغور مطالعہ کیا بلکہ اپنے قیام یورپ کے دوران اس نظام کو اس کے ماخذ اور اصل کی نسبت سے سمجھا۔ اس فکری تربیت و استحکام اور اپنے گہرے مشاہدے و عملی تجربے کی بنیاد پر ہی ان کی رائے میں برصغیر بلکہ مشرق کے زوال اور اس کی مشکلات کی بنیادی وجہ مغربی تہذیبی اور سیاسی استعمار کی چیرہ دستیاں تھیں۔

برصغیر کے دگرگوں حالات کی اس تشخیص اور مغرب کی ہمہ جہتی برتری کے باوجود اقبال نے نہ صرف اپنے زمانے کے حالات کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے بلکہ بظاہر قنوطیت کی اُس عمومی کیفیت میں ایک نئے روشن دور اور نئے زمانے کی تصویر دنیا کو دکھلائی جس کا امکان اس وقت ناممکنات میں سے تھا۔ مجنوں گورکھپوری نے اقبال کی شخصیت کے اس پہلو کے حوالے سے کیا خوب تبصرہ کیا ہے: "وہ بیک وقت اپنے زمانے کی مخلوق بھی تھے اور ایک نئے زمانے کے پروردگار بھی۔" (2)

ان ہی وجوہات کی بنا پر انہوں نے اپنی فلسفیانہ بصیرت اور شعر گوئی کی قوت کو ایک طرف تو مغربی استحصالی اور استعماری قوتوں کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کیا اور دوسری طرف اس کے ذریعے مسلمانوں کو اپنے فکری انحطاط، سیاسی جمود اور تعطل کی طرف متوجہ کیا اور ان سے چھٹکارا حاصل کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ چنانچہ اقبال کے کلام کا ایک بڑا حصہ اسی فکری تعطل، بے خبری اور بے عملی کی طرف متوجہ کرتا ہے جس کا شکار مسلمان انگریزوں کے دِ غلامی میں بنے ہوئے تھے۔ اقبال کی سوچ میں انسان کے لیے مایوسی، کم نظری اور کم ہمتی کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور یہ اس کے مقامِ انسانیت سے فروتر ہے کہ وہ ایک غلام کی حیثیت سے زندگی گزارے اور اس سے بھی بڑھ کر اپنی اس غلامی کو ذہنی طور پر قبول کر کے اس پر مطمئن ہو جائے۔

آزادی اور زندگی کا یہ پیغام محض برصغیر کے باسیوں تک محدود نہیں تھا بلکہ دنیا میں جہاں جہاں بھی انسانیت غلامی کے شکنجوں میں پھنسی سسک رہی تھی، سب کے لیے اقبال کا تصور آزادی یکساں تھا۔ اس کی جھلک ان کی شاعری میں جابجا ملتی ہے۔ لیکن چونکہ اقبال نے خود ایک محکوم قوم میں آنکھ کھولی اور اس تمام منظر کو ایک عینی شاہد کے طور پر دیکھا اس لیے ایک سچی تڑپ اور درد کا اظہار ان کی شاعری میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ وہ غاصب طبقے کی چیرہ دستیوں اور ہتھکنڈوں سے آگاہی دیتے نظر آتے ہیں۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری(3)

ایسی صورتحال میں اقبال محکوم کے حق میں ایک توانا آواز بن کر ابھرے۔ انہوں نے ایک طرف جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف انگریزوں کی سامراجی دہشت اور قبضے کے خلاف پوری قوت سے معرکہ آرا ہو گئے۔ مجنوں گورکھپوری نے لکھاہے:۔

"اقبال ان لوگوں میں نہیں جو سوچ سوچ کر رہ جائیں یا سمجھ سمجھ کر پچھتائیں۔ اور نہ وہ زندگی کے آلام اور صعوبات سے بچنے کے لیے کوئی سستے قسم کا نسخہ بتاتے۔ ان کے نگاہیں زندگی پر گہری پڑتی ہیں اور وہ نہایت واضح اور حقیقی نتائج پر پہنچے ہیں۔ جن کو انہوں نے باضابطہ مرتب کر کے ایک مستقل پیغام کی صورت میں ہم کو دیاہے۔" (4)

اقبال کا یہ توانا انداز اور جاندار آواز ہمیں ان کی اس دور کی شاعری میں جابجا نظر آتی ہے جس سے اقبال کی بصیرت، فکری سطح اور حالات کو صحیح نہج پر پرکھنے کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

وطن کی فکرکر ناداں مصیبت آنےوالی ہے
تری بربادیوں کےمشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہورہا ہے، ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں
یہ خاموشی کہاں تک لذت فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
یہی آئین قدرت ہے یہی اسلوب فطرت ہے
جو ہے راہ عمل میں گامزن محبوب فطرت ہے
ہو یدا آج اپنے زخم پنہاں کرکے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کرکے چھوڑوں گا (5)

اقبال کا تصورِ حیات

اقبال انتہائی پختہ فکر اور فلسفہ کے حامل شاعر ہیں اور ان کے کلام میں حیاتِ انسانی جیسے اہم موضوع کے حوالے سے واضح سوچ دکھائی دیتی ہے۔ اقبال فلسفۂ شرق و غرب پر نظر رکھتے تھے اور بذات خود ایک فلسفی تھے لیکن ان تصور حیات سمیت ان کے دیگر تصورات پر ایمان اور قرآن و حدیث کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ اس کائنات کے اندر زندگی کے تصور کے حوالے سے ان کا مثالی انسان ایک مرد مومن ہے جو حریتِ انسانی اور خودی جیسی بلند خوبیوں سے متصف ہے۔ ان کی مثالی زندگی ایسی زندگی ہے جو حق سے عبارت ہو، کشمکش جس کا ناگزیر جزو ہو اور جس میں اصل اہمیت کائنات میں سرگرم عمل منفی قوتوں اور استبداد کی ہر صورت سے نبرد آزما ہونے کو حاصل ہے۔ چنانچہ شاہین کا استعارہ بھی ان کی اسی فکر کا غماز ہے۔

"اسی پیکر کا نام مردِ مومن ہے جس کی فطرت مہر نبوت سے مستنیز اور جس کی نگاہ فرمودۂ تقدیر ہے۔ وہ قلب گداز جو سوختگی سے پگھل جاتا ہے اور وہ پنجۂ فولاد جو دستِ قضا سے قوت آزما ہے اسی کے حصے میں آیا ہے اور وہ عاشق جس کے فروغ سے کائنات روشن ہے اور وہ عمل جس کا تسلسل گردشِ ایام پر خندہ زن ہے اسی کو ارزانی ہوا ہے۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن"(6)

اقبال کے نزدیک زندگی مادی حیات و موت سے عبارت نہیں ہے بلکہ اس سے بالاتر ہو کر خودی کے وجود میں پنہاں ہے۔

یہ عالم کہ بت خانۂ چشم و گوش
جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش
تری آگ اس خاکداں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں (7)

حیات و موت نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے، خودی کی نگاہ کا مقصود (8)

اقبال کی شکل میں ایک غلام قوم کے اندر بھی ایک ایسا فردِ آزاد نمودار ہوا جس نے اپنی شاعری کے ذریعے بظاہر مردہ قوم کو زندگی، بصیرت، حرکت و عمل، ہمت و جرات، بیداری اور قوت کا پیغام دیا اور ان کے گم گشتہ یقین اور اعتماد کو بحال کرنے میں دن رات صرف کر دیے کیوں کہ ان کو یقین تھا کہ اس قوم کا حتمی معرکہ آخر کار اسی مغربی استعمار سے برپا ہونے والا ہے اور ان صفات سے متصف ہوئے بغیر کوئی بھی قوم اپنی آزادی کے معرکے میں سرفراز نہیں ہو سکتی۔

ترا تن روح سے نا آشنا ہے
عجب کیا آہ تیری نا رسا ہے
تنِ بے روح سے بیزار ہے حق
خدائے زندہ زندوں کا خدا ہے (9)

زندگی اور تحرک کا یہ پیغام اقبال کے تمام تر کلام کا کلیدی عنصر ہے اور اس سے ان کے تصور حیات کی تفہیم میں بھی مدد ملتی ہے کہ اقبال کے فکری نظام میں آخر ایک انسان اور ابن آدم کی کیا حیثیت ہے اور اقبال اس کو کن صفات کا حامل اور کس مقام پر متمکن دیکھنا چاہتے ہیں۔

اقبال کا تصورِ حیات اور آزادی

یہ سوال اہم ہے کہ کیا اقبال کے نزدیک زندگی اور آزادی متبادل کے طور پر استعمال ہوئے ہیں؟ کیا آزادی کے بغیر زندگی کا کوئی تصور اقبال کے ہاں پایا جاتا ہے؟

اقبال کے ہاں انسانی حریت، خواہ وہ فکری ہو یا مادی، انسانی حیات کے ایک بنیادی لازمی عنصر کے طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اقبال کے ہاں یہ بات ناقابل قبول ہے کہ ایک باشعور جیتا جاگتا وجود کسی بھی پہلو سے محکومی جیسی پستی میں مبتلا ہو، کجا کہ وہ اس پر راضی اور مطمئن بھی نظر آئے۔ اقبال کے ہاں کسی علامتی اظہار کی بجائے آزاد اور محکوم کی بالکل واضح پہچان ملتی ہے اور دونوں کی زندگیوں میں زمین و آسمان کا فرق نمایاں نظر آتا ہے۔

آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال
کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
آزاد کا ہر لحظہ پیام ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگ مناجات

آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور
محکوم کا اندیشہ گرفتار خرابات
محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات (10)

زندگی اور آزادی کا لازم و ملزوم ہونا اقبال کے نزدیک اتنا واضح ہے کہ بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ دونوں الفاظ مترادفات کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔ اقبال کے نزدیک غلامی ایک لعنت اور زندگی کی توہین ہے اور اپنے ہم وطنوں کو اس میں مبتلا دیکھ کر اقبال انتہائی غمزدہ تھے۔ چنانچہ اہالیانِ برصغیر کے دوغلامی کے حوالے سے یہی درد ان کے اشعار میں بھی ڈھل گیا ہے۔ اپنی قوم کی غلامی کی اس حالتِ زار کو دیکھ کر علامہ اقبال پر کیا گزرتی ہو گی، تصویرِ درد جیسی نظم ہمیں بخوبی اس کیفیت سے آگاہ کر سکتی ہے۔

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلک ا زل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
نشان برگ گل تک بھی نہ چھوڑا س باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں (11)

زندگی سے وابستہ جتنے بھی اعلیٰ و ارفع مقاصد ہیں ان کا حصول محض ایک آزاد وجود کے لیے ہی ممکن ہے۔ ورنہ زندگی تو محکوم بھی گزار لیتے ہیں البتہ ان کی زندگی اور وجود کی زمانے میں کوئی وقعت نہیں ہوتی اور ان کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہوتا ہے۔ کائنات بھی انہی پر اپنے نہاں خزانوں کے دروازے کھولتی ہے جو اپنی قوتِ فکر اور حریت کے زیر اثر کچھ کر دکھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور جن کا ہر قدم اپنی ذات کو بلند سے بلند تر مقام کی طرف لے جانے کے لیے ہوتا ہے۔ دراصل یہ مقام صرف اسی کو حاصل ہو سکتا ہے جس کی سوچ اور جسم کسی اور کے قبضے میں نہ ہو اور جس کے لیے حدِ پرواز صرف اور صرف اس کا اپنا تخیل اور اپنی قوت ہو۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بے کراں ہے زندگی (12)

ایک محکوم کے لیے سوچ اور عمل کی دنیا بہت محدود بھی ہوتی ہے اور اس محدود دائرۂ کار میں بھی وہ خود اپنی ذات کا مالک نہیں ہوتا۔ چنانچہ زندگی کے لیے اس کا ہونا یا نہ ہونا بے معنی ہے۔ یہ ضرور ممکن ہے کہ خود محکوم کو بھی اپنی حالتِ زار سے آگاہی اور احساس نہ ہو لیکن دیدۂ بینا رکھنے والوں کے لیے یہ انتہائی تشویشناک صورتحال ہوتی ہے۔ ایسی زندگی محکوم کے لیے مستقل عذاب کی صورت ہے جس میں وہ خود بھی مبتلا رہتا ہے اور اس کے حوالے سے پوری انسانیت بھی اس کے ساتھ سسکتی رہتی ہے۔ اقبال کے ہاں زندگی اور آزادی جبکہ محکومی اور موت کے یہ تصورات اس طرح ایک دوسرے میں پیوست نظر آتے ہیں کہ اس حوالے سے کوئی ابہام باقی نہیں رہتا۔

آزاد کی رگ سخت ہے مانندِ رگِ سنگ
محکوم کی رگ نرم ہے مانندِ رگِ تاک
محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید
آزاد کا دل زندہ و پرسوز و طرب ناک
آزاد کی دولت دلِ روشن، نفسِ گرم
محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک
محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروت
ہرچند کہ منطق دلیلوں میں ہے چالاک
ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہمدوش
وہ بندۂ افلاک ہے، یہ خواجۂ افلاک (13)

چنانچہ محکوم بندۂ افلاک ہونے کی بنا پر کارِجہاں گیری جیسی آفاقی ذمہ داری ادا کرنے سے یکسر قاصر ہے اور وہ اپنے لیے بہتر یہی گردانتا ہے کہ چند بے ضرر قسم کے کاموں میں الجھا رہے، جس سے بظاہر تو اس کی کوئی نہ کوئی شناخت بن سکتی ہے لیکن اس سے نہ کسی استبداد کو خطرہ ہے اور نہ کوئی اجتماعی سوچ پنپنے کہ صورت پیدا ہو سکتی ہے۔

محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی
موسیقی و صورت گری و علم نباتات (14)

اقبال کا تصورِ حیات اور خودی

اقبال کے فکری نظام میں خودی کے تصور کو مرکزی حیثیت حاصل ہے بلکہ اگر خودی کو ان کا فلسفۂ حیات کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ معروف معنوں میں تو خودی کو عموماً غرور، تکبر اور خود خواہی کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے لیکن اقبال نے اس کے مفہوم کو ایک بالکل نئی جہت عطا کی اور اسے اپنی ذات اور نفس کے مقام کا تعین قرار دیا۔ یوں تو فلسفۂ خودی کا اکثر بیان اقبال کے ہاں ان کے فارسی کلام میں ملتا ہے لیکن ان کی اردو شاعری بھی اس سے تہی دامن نہیں ہے اور ہمیں جابجا اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اقبال کے نزدیک خودی کے بغیر زندگی کا تصور ناممکن ہے۔ خودی کا وجود اور استحکام ایک زندہ فرد کو منفی اور باطل قوتوں کے خلاف میدان عمل میں لا کھڑا کرتا ہے اور دنیا میں موجود ظلم، جہالت، فساد اور فتنہ سے برسرپیکار کر دیتا ہے۔ چنانچہ دنیا میں خیر و شر کے درمیان جاری کشمکش دراصل اس بات کی نوید ہے کہ زندگی ابھی خودی کے وجود سے خالی نہیں ہوئی۔

"خیر و شر کے کارزار میں خیر کے علمبردار کے پاس، جو دنیا میں خدا کا نائب بھی ہونا چاہتا ہے، کیا ہتھیار ہے! اقبال کے خیال میں یہ ہتھیار اور ذریعہ خود انسان کی اپنی خودی ہے کہ جب وہ پختہ ہو تو نہ صرف شر کی حریفِ غالب ہوتی ہے بلکہ وہ تمام قدروں کی آخری قدر بھی ہے۔" (15)

یہ موجِ نفس کیا ہے؟ تلوار ہے!   خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات   خودی کیا ہے؟ بیداریٔ کائنات (16)

ایک زندہ فرد کے اندر بے پناہ صلاحیتیں پوشیدہ اور خوابیدہ ہوتی ہیں۔ اقبال کے نزدیک خودی دراصل ان صلاحیتوں کو پہچاننے، بیدار کرنے اور کارگاہِ حیات میں روبہ عمل لانے کا ذریعہ ہے۔ ان کے مطابق یہ قوت دراصل کائنات میں ہمیشہ سے موجود ہے اور انسانی زندگی کو اس سے متصف کرنا دراصل انسان کو مقامِ آدمیت کی اہم ترین ذمہ داری دینے کے عمل کا حصہ ہے۔

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر   ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے   فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے (17)

اقبال کے فلسفۂ خودی کے مطابق یہ نہ صرف اپنی ذات کو پہچاننے کا رستہ ہے بلکہ زندگی کی حقیقت اور خود اپنے خالق کی معرفت کا رستہ بھی یہی ہے۔ خودی انسان کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ اپنی خود داری اور غیرت کو اپنے ہتھیار بنا کر کائنات کی قوتوں کے ساتھ بر سرِ پیکار رہے۔

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی
نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہ فقیر
خودی ہو زندہ تو دریائے بے کراں پایاب
خودی ہو زندہ تو کہسار پر نیان و حریر
نہنگ زندہ ہے اپنے محیط میں آزاد
نہنگ مردہ کو موج سراب بھی زنجیر!(18)

اقبال کے نزدیک اگر فرد اپنی خودی کو پہچان کر اس کے شایان شان کام لیتا ہے تو اپنی زندگی کے دھارے کا رخ کسی طرف بھی موڑ سکتا ہے اور در حقیقت ایک زندہ و بیدار انسان سے یہی مطلوب ہے کہ اپنے خالق حقیقی کی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگی کے خاکے کو ترتیب دے۔

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیر یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے (19)

تحرک، کشمکش اور زندگی

کیا اقبال کے ہاں زندگی کا تصور ایک جامد اور ٹھہری ہوئی شے کا ہے یا اس میں کسی ہلچل، کشمکش اور تحرک کا پہلو بھی ہے؟ یا پھر زندگی برائے محض زندگی ہی اقبال کے نزدیک اصل مقصود ہے؟ اقبال کے کلام سے ہمیں واضح طور پر اس کی نفی نظر آتی ہے۔ اقبال کے ہاں زندگی کا تصور کوئی اکیلا اور مفرد تصور نہیں ہے۔ اقبال کے ہاں واضح طور پر اس تصور کا پرچار نظر آتا ہے کہ زندگی ایک نعمت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑی ذمہ داری اور منصب بھی ہے۔ چنانچہ اس منصب اور ذمہ داری کے شایان شان اس سے عہدہ بر آ ہونے کے لیے مطلوبہ صلاحیت اور حالات پیدا کرنا ایک زندہ انسان کے بنیادی فرائض میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا تصور ہے جو انسان کو مستقل ایک تحرک پر آمادہ کیے رکھتا ہے۔ یہ تحرک انفرادی سطح پر افراد اور اجتماعی سطح پر قوموں کے لیے بھی ناگزیر ہے۔

جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات، کشمکشِ انقلاب (20)

مولانا صلاح الدین احمد فکرِ اقبال کی روشنی میں اس نکتے کو یوں واضح کرتے ہیں۔

"جہانِ انسانی میں بھی وہ افراد و اقوام جو تصادم سے گریز کرتے اور اپنے قویٰ کو امتحان و آزمائش میں نہیں ڈالتے، حقیقت میں منشائے خداوندی سے اعراض کرتے ہیں اور اس گریز و فرار کا بالعموم یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کے فطری قویٰ کمزور ہو کر عمل کے قابل نہیں رہتے۔ پھر زوال بہت جلد انہیں آلیتا ہے اور ان کے سفرِ زندگی کو نہ صرف مختصر کر دیتا ہے بلکہ انہیں اس ذلت و محرومی سے بھی آشنا کر دیتا ہے جو دنیا میں کمزور افراد و اقوام کا حصہ ہے۔" (21)

اقبال زندگی کو جس شعوری اور فکری سطح پر دیکھنا چاہتے ہیں اور ان کے کلام میں ایک زندہ و بیدار انسان جس مقام و مرتبہ پر متمکن ہے اس کا حصول کسی کشمکش اور مزاحمت کے بغیر ناممکن ہے۔ یہ کشمکش داخلی اور خارجی دونوں سطح پر ہوتی ہے۔ داخلی سطح پر انسان کی اپنی ہی خواہشات اور نفس اس کے مقابل ہوتا ہے جب کہ خارجی سطح پر کائنات میں موجود ظلم، فتنہ وفساد اور منفی قوتوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ اقبال اسی کشمکش کو انسانی شخصیت کی تراش خراش کا ذریعہ گردانتے ہیں جو انسانی صلاحیتوں کو جِلا بخشتی اور اس کے اندر چھپے جوہرِ زندگی کو کسی ماہر صراف کی مانند صیقل کر دیتی ہے۔

دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا
زندگی موت ہے، کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش (22)

قرآنِ کریم میں سورہ انشقاق میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يَآ اَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ

"اے انسان، تو کشاں کشاں اپنے رب کی طرف چلے جا رہا ہے۔" (23)

انسان کو یہ مادی زندگی بہت مختصر عطا کی گئی ہے جس میں وہ عملِ پیہم کے ذریعے ہی آگے بڑھ سکتا ہے۔ اقبال نے اپنے پیغام کے ذریعے انسان کے لیے اسی نکتہ کا ابلاغ کیا ہے کہ خالقِ کائنات نے انسان کے لیے جو معیار اور مقام پسند فرمایا ہے وہ سہل پسند اور عیش پرست افراد کے نصیب کی بات نہیں ہے۔ اس مقام و مرتبہ تک پہنچنے کے لیے ایک جہدِ مسلسل درکار ہے۔ اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ خود انسان کو

اس بات کا شعور اور ادراک ہونا چاہیے کہ یہ سب تگ و دو آخر وہ خود کس لیے کر رہا ہے۔ چنانچہ شعور و آگہی کا یہ سفر مہد سے لحد تک جاری رہتا ہے اور انسان اس کے دوران جد وجہد کے مختلف مراحل سے گزرتا رہتا ہے۔

پختہ تر ہے گردش پیہم سے جام زندگی
ہے یہی اے بے خبر راز دوام زندگی (24)

اقبال تو اس ضمن میں اس بات کو گوارا ہی نہیں کرتے کہ کسی منزل کا تعین بھی ہونا چاہیے۔ کیونکہ آخر کار ایک متعین اور طے شدہ منزل کبھی نہ کبھی سفر کے اختتام کا باعث بن جائے گی لیکن اقبال کا تصور زندگی محض سفر سے عبارت ہے جس میں کہیں رکنے کی گنجائش بھی موجود نہیں ہے۔ اس لیے ان کے نزدیک ہر مقام محض نشان راہ ہی ہے جس کے آگے کہیں ایک اور مقام رہرو کے لیے منتظر ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم کی مذکورہ بالا آیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے بھی دیکھیں تو سفر کا یہ لامتناہی سلسہ جاری رہتا ہے حتٰی کہ ملک الموت اسے اپنے خالق حقیقی سے ملاقات کا بلاوا لیے آپہنچتا ہے۔

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں(25)

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی(26)

چنانچہ قاضی عدیل علیگ لکھتے ہیں۔ اقبال کے ہاں حرکت اور سفر تقاضائے حیات ہیں۔ 'سکون پرستی' نہ صرف غلط بلکہ ایک مرض ہے۔" (27)

مولانا صلاح الدین احمد اس حوالے سے یوں رقم طراز ہیں۔ "زندگی اور موت میں جو چیز مابہ الامتیاز ہے اور جس سے وجود و عدم کا فرق بیک نظر نمایاں ہو جاتا ہے، بلاشبہ وہ حرکت ہے۔" (28)

چند چیدہ چیدہ پہلوؤں سے اقبال کے تصورِ حیات پر نظر ڈالنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال نے زندگی، موت اور ان سے منسلک آزادی اور محکومی کے حوالے سے وہ توانا تصورات پیش کیے جو کسی بھی قوم کی بقا اور تسلسل کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ فکرِ اقبال کے ان پہلوؤں کی تفہیم اور ابلاغ کے حوالے سے وسیع پیمانے پر کاوش کی جائے اور خاص طور پر نئی نسل کو اس پیغام سے روشناس کروانے کے لیے ہر سطح پر اہتمام کیا جائے تاکہ اپنی قومی زندگی میں یہ نوجوان نسل فکری اور نظریاتی طور پر واضح اور اعلیٰ و ارفع مقاصد کے حصول کے لیے میدان عمل میں اتر آئے۔

یہ ہے خلاصۂ علم قلندری کہ حیات
خدنگِ جستہ ہے لیکن کماں سے دور نہیں (29)

حوالہ جات:

۱۔ اقبال: اجمالی تبصرہ، مجنوں گورکھپوری، یونین پرنٹنگ پریس، دہلی، 1955، ص13
۲۔ اقبال: اجمالی تبصرہ، مجنوں گورکھپوری، یونین پرنٹنگ پریس، دہلی،1955، ص7
۳۔ خضرراہ، بانگ درا، ص273
۴۔ اقبال: اجمالی تبصرہ، مجنوں گورکھپوری، یونین پرنٹنگ پریس، دہلی،1955، ص 11
۵۔ تصویر درد، بانگ درا، ص82
۶۔ تصورات اقبال، مولانا صلاح الدین احمد، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ،1974،، ص 336
۷۔ بالِ جبریل، ساقی نامہ، ص 132
۸۔ مقصود، ضربِ کلیم، ص 82
۹۔ بال جبریل، ص91
۱۰۔ ہندی مکتب، ضرب کلیم، ص91
۱۱۔ تصویر درد، بانگ درا، ص 84
۱۲۔ خضرراہ، بانگ درا، ص272
۱۳۔ ارمغان حجاز، ص52
۱۴۔ ہندی مکتب، ضرب کلیم، ص 92
۱۵۔ ڈاکٹر نذیر احمد، نقوش اقبال نمبر، شمارہ 121 ،ادارۂ فروغِ اردو، لاہور، ستمبر 1977، ص 272
۱۶۔ ساقی نامہ، بال جبریل، ص 131
۱۷۔ ساقی نامہ، بال جبریل، ص 132
۱۸۔ خودی کی زندگی، ضرب کلیم، ص89
۱۹۔ ارمغان حجاز، ص42
۲۰۔ مسجد قرطبہ، بال جبریل، ص104
۲۱۔ تصورات اقبال، مولانا صلاح الدین احمد، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ،1974، ص 396
۲۲۔ مدرسہ، ضرب کلیم، ص96
۲۳۔ تفہیم القرآن جلد 6، ابوالاعلیٰ مودودی، ص 288
۲۴۔ جواب خضر، بانگ درا، ص27
۲۵۔ بال جبریل، ص 54
۲۶۔ ساقی نامہ، بال جبریل ص 130
۲۷۔ اقبال کا فلسفۂ حیات و شاعری، قاضی محمد عدیل عباسی علیگ، بک سروس، دہلی، 1971، ص 91

۲۸۔ تصورات اقبال، مولانا صلاح الدین احمد، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ،1974، ص 394
۲۹۔ بال جبریل، ص 56

کتابیات :

۱۔ کلیات اقبال، علامہ اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور،1990 ۔
۲۔ اقبال شخصیت اور فن، رفیع الدین ہاشمی ، اکادمی ادبیات پاکستان2008۔
۳۔ ذکر اقبال، عبد المجید سالک، بزم اقبال، لاہور1983۔
۴۔ اقبال: اجمالی تبصرہ، مجنوں گور کھپوری، آزاد کتاب گھر، دہلی1955۔
۵۔ اقبال اور عظمتِ آدم، قدیر امتیاز، بہ تعاون پاکستان ہائی کمیشن دہلی، شالیمار پبلیکیشنز، حیدر آباد۔
۶۔ تصورات اقبال، مولانا صلاح الدین احمد، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1974۔
۷۔ اقبال کا فلسفۂ خودی، ڈاکٹر آصف جاہ کاروانی، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی۔
۸۔ اقبال کا تصور خودی، ڈاکٹر غلام عمر خان، ادارۂ ادبیات اردو، حیدر آباد انڈیا1966۔
۹۔ مطالب بانگ درا، غلام رسول مہر، چمن بکڈپو، دہلی۔
۱۰۔ سہ ماہی مجلہ "اقبال" کے مختلف شمارے، مدیر ڈاکٹر وحید احمد قریشی۔
۱۱۔ اقبال کا فلسفۂ حیات وشاعری، قاضی محمد عدیل عباسی علیگ، بک سروس، دہلی 1971۔
۱۲۔ اقبال کا ذہنی وفکری ارتقاء، تالیف ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، بزم اقبال، لاہور۔
۱۳۔ فلسفۂ اقبال، مضامین، مرتبہ بزم اقبال، لاہور 1970۔
۱۴۔ نقوش، اقبال نمبر، شمارہ 121 اور123، ادارۂ فروغِ اردو، لاہور 1977۔
۱۵۔ مطالعۂ اقبال کے چند پہلو، مرزا ادیب، بزم اقبال، لاہور 1985۔
۱۶۔ اقبال کا ادبی نصب العین، مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلیکیشنز، لاہور۔
۱۷۔ سرگزشت اقبال، ڈاکٹر عبد السلام خورشید، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور 1977۔

☆☆☆☆☆